Negotiations 3:3 (July-Sep. 2023) pp. 11-27 ISSN: 2789-293X

"نگری نگری پھرا مسافر" میں تانیثی کرداروں کے معاشرتی مسائل۔پاکستانی معاشرت کے تناظر میں

Social problems of female characters in "Nagri Nagri Phira Musafar" in the context of Pakistani society

Dr. Mohsin Khalid Mhosin
mohsinkhalid53@gmial.com
Lecture, Department of Urdu, Govt. Shah Hussain Associate College, Lahore, Pakistan
Imama Riasat
Imamariasat2020@gmail.com
Ph.D. Scholar-Urdu, Northern University, Nosherah, Pakistan

KEYWORDS

Urdu novel
Social Problems
Identification Dlemmas
Fantiscism
Consciousness
Male Oppression
Insecurity
Self-esteem
Hypocritical behaviour

DATES

Received	**20-07-2023**
Accepted	**10-09-2023**
Published	**30-09-2023**

QR CODE

ABSTRACT

This paper is an attempt to present an analysis of the social dynamics of female roles in Pakistani society and to identify the causes and motivations behind these problems. If we consider the tradition of Pakistani Urdu novels, countless novelists have created novels in which the story revolves around only one main character. Nisar Aziz but "Nagri Nagri Phira Masafari" is also a novel whose story revolves around "Afgar," but the author has skillfully shed light on the various social problems that most of the girls in our society are facing through this main character. It affects the personality of the youth.

DOI:
http://journals.mehkaa.com/index.php/negotiations/article/view/87

تلخیص:

پاکستانی اُردو ناول کی روایت پر غور کیا جائے تو بے شمار ناول نگاروں نے ایسے ناولوں کو وجود دیا جس میں کہانی صرف ایک مرکزی کردار کے گرد گھومتی ہے۔ نثار عزیز بٹ کا "نگری نگری پھرا مسافر" بھی ایک ایسا ناول ہے جس کی کہانی "افگار" کے گرد گھومتی ہے لیکن مصنفہ نے کمال مہارت سے اس مرکزی کردار کے ذریعے ان مختلف معاشرتی مسائل پر روشنی ڈالی ہے جن سے ہمارے معاشرے کی اکثر لڑکیوں کو واسطہ پڑتا ہے اور جو ان کی شخصیت کو بُری طرح متاثر کرتے ہیں۔ یہ مقالہ پاکستانی معاشرت میں تانیثی کرداروں کے معاشرتی خلجان کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے ان مسائل کی نشاندہی کے ساتھ پروردہ اسباب و محرکات کو سامنے لانے کی ایک کوشش ہے۔

نگری نگری پھرا مسافر ناول 1956ء میں مکتبہ اردو کے زیر اہتمام اشاعت پذیر ہوا۔ یہ ناول تقریباً 639 صفحات پر مشتمل ہے۔ یوں تو اس ناول میں بے شمار کردار پائے جاتے ہیں لیکن مرکزی حیثیت افگار کی ہے۔ اگر اس ناول کے پس منظری مطالعے کے حوالے سے بات کی جائے تو ایسا کہنا غلط نہ ہو گا کہ اس ناول کو لکھنے کی تحریک مصنفہ کو اس وقت ہوئی جب وہ خود تپ دق میں مبتلا ہونے پر باعث علالت سینی ٹوریم میں علاج کروا رہیں تھیں۔

اس ناول کی نوعیت چوں کہ ایک سفر نامے کی سی ہے جس کی وجہ سے ایک قاری اس کے مرکزی خیال کو مختلف سطحوں پر جانچنے کی کوشش کرتا ہے اور جو بنیادی سوچ آنکھوں کے سامنے یا ذہن کے پردے پر چھاتی ہے وہ یہ ہے کہ ناول کے مرکزی کردار کو ایک آئیڈیل کی تلاش ہے لیکن اگر ہم باریک بین انداز میں اس ناول کا مطالعہ کریں تو ایک قاری کی حیثیت سے میری رائے کے مطابق یہ ناول ہمارے معاشرے میں پائے جانے والی مختلف نوجوان لڑکیوں کی ذہنی، جذباتی اور معاشرتی مسائل کی عکاسی کرتا ہے اور بالخصوص یہ عکاسی اس وقت زیادہ ہوتی ہے جب افگار اپنا وقت سینی ٹوریم گزارتی ہے۔

ناول کی شروعات پڑھنے کے بعد ایک رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ انسان کی ذہنی، فکری، اخلاقی، کرداری، معاشرتی اور عملی نشو نما میں جہاں اور بہت سے عوامل و عناصر اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں وہیں پر تعلیم و تربیت، روایات، علم و فن، تجربات، عقائد و نظریات اور سب سے بڑھ کر ماحول بھی اہم ہے۔ انسان چاہے وہ کسی بھی معاشرے کا حصہ ہو مکمل طور پر خود کفیل اور مکمل نہیں ہے۔ اس حوالے سے ناول "نگری نگری پھرا مسافر" کی ابتدا قابل غور ہے:

> "میرا کوئی خدا نہیں۔ یہ زمین کانٹوں سے بھرپور ایک وسیع جنگل ہے جس میں خونخوار درندے بستے ہیں۔ رحم کا نام و نشان نہیں۔ تمام پھولوں اور پھلوں میں زہر ملا ہے۔ سوچ مصیبتوں کا پیش خیمہ ہے۔ رات دن کی نسبت کچھ رحم دل محسوس ہوتی ہے۔ میری مزدوری یہی ہے کہ دن بھر محنت کروں، اوروں کو امیر بناؤں لیکن میرے بال بچوں کو پیٹ بھر کے روٹی نہ ملے، کپڑے نہ ملیں، خوشی کی زندگی

مجھ سے کوسوں دور ہے۔ میں محنت کروں ۔۔ پودے لگاؤں ۔۔پانی دے کر ان کو بڑا کروں، وقت پر پھل اور کھائیں۔ سائے میں آرام کوئی اور کرے۔ دوزخ یہی ہے۔ میرا دوزخ یہی ہے۔ خدا نہیں۔۔ میرا خدا نہیں۔"(1)

بلاشبہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس دنیا میں جتنی بھی نعمتوں سے نوازا ہے ان میں سب سے قیمتی نعمت والدین ہیں جن کا سایہ بچوں کے لیے باعث رحمت جب کہ ان کی گھر میں موجودگی باعث برکت ہے۔ والدین جب تک حیات رہتے ہیں وہ اپنے بچوں کو دنیا کے ہر سرد و گرم سے بچاتے ہیں لیکن ہمارے معاشرے میں ایسے بچوں کی بھی کمی نہیں جو اس عظیم نعمت و دولت سے محروم ہیں اور جن کو دیکھنے والا کوئی نہیں اور وہ خود ہی دنیا کے تھپیڑ کھاتے ہوئے جوان ہو جاتے ہیں۔

جب کسی بچے کے والدین کم عمری میں وفات پا جائیں تو پھر ایسے بچوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری کوئی اپنے سر لینے کو تیار نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ خاندان کا ہر فرد جو والدین کی موجودگی میں پیار کرتے نہیں تھکتا ان کے نہ ہونے پر آنکھیں پھیر لیتا ہے۔ والدین سے محروم بچے اگر دولت و جائیداد کے مالک ہوں تو پھر ماں و باپ دونوں کے رشتہ دار صرف جائیداد پر قبضہ جمانے کے لیے دنیا دکھاوے کو اپنے گھر تو رکھ لیتے ہیں لیکن وہ توجہ، پیار، مہربانی، اور شفقت نہیں دے پاتے جو وہ اپنے بچوں کو دیتے ہیں اور ان کے لیے محسوس کرتے ہیں یا شاید یہی دنیا کا دستور ہے جہاں انسان کو قدم قدم پر دھوکہ دہی اور مکر و فریب سے واسطہ پڑتا ہے۔

اس ناول کا مرکزی کردار افگار اپنے بچپن میں والدین کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے بعد ایسے ہی نامساعد حالات کا سامنا کرتی ہے کہ جس کی ذمہ داری اٹھانے کو کوئی خالہ، ماموں، تایا، چچا اور پھوپھی تیار نہیں ہوتے صرف اس خوف سے کہ کہیں انھیں مستقبل میں اس بن ماں باپ کی بچی پر خرچہ نہ کرنا پڑ جائے۔ افگار کے والدین جب ہیضہ جیسی موذی مرض کا شکار ہو جانے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔ تو افگار کو جن تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ ناول ''نگری نگری پھرا مسافر'' کا یہ حصہ پڑھنے کے بعد ایک قاری بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے:

"افگار کی پرورش اس کے رشتہ داروں کے لیے ایک مشکل مسئلہ بن گیا۔ اگر چچا ہوتا یا صرف ایک خالہ ہوتی یا ایک پھوپھی ہوتی تو وہ درویش بر جان درویش اس کو اپنی ذمہ داری سمجھ کر برداشت کر لیتے لیکن یہاں دو چچاؤں اور تین خالاؤں کے درمیان افگار ایک طویل جھگڑے کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ ماں کے رشتہ دار کہتے کہ چوں کہ افگار کے باپ کی جائیداد افگار کے چچاؤں کے لئے رہ گئی ہے اس لیے بچی کو بھی وہ سنبھالیں۔ آخر ایک دن کی بات تو نہیں کل کو بیاہ شادی کا خرچ کون کرے گا۔ چچا کہتے کہ گھر کا سامان، جہیز کے کپڑے اور زیور تو ان بیبیوں نے بہن کے مرتے مرتے گھر سے نکال نکال کر اپنے گھر منتقل کیا اب لڑکی کو بھی سنبھالیں۔ اس طرح چار سال افگار ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک سے دوسری خالہ اور ایک چچا سے دوسرے چچا کے گھر منتقل ہوتی رہی اور اس کی مستقل رہائش کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ ہر جگہ اس کے ساتھ یکساں بے نیازی کا سلوک ہوتا۔ محبت کر کے کون گلے آفت ڈالتا۔"(2)

والدین سے محرومی اور رشتہ داروں سے بے نیازانہ سلوک نے نتیجتاً افگار کو تنہا کر دیا یہاں تک کہ وہ کسی پر اعتماد نہ کر سکی اور تن تنہا منزل کی جانب رواں دواں دکھائی دیتی ہے کیوں کہ وقت اور حالات نے اسے اپنی ذات میں خوش رہنے اور بہت آگے جا کر اپنی منزل تلاش کرنے کا فن سکھا دیا تھا۔

افگار دراصل خیالی اور عملی دونوں سطح اور سوچوں کے درمیان بسنے والا کردار ہے کہ جب منصور اس کی طرف بڑھتا ہے تو وہ محبت اور منصور کو جسمانی ومادی ضرورت کے تحت سوچتی ہے اور پھر پیچھے ہٹتی ہے اور جب عرفان سامنے آتا ہے تو پھر سوچوں کا نیا سلسلہ جنم لے کر اس کو انکار کیا جاتا ہے۔ آگے چل کر وہ نعیم کے بارے میں بھی اچھا سوچتی ہے لیکن کوئی واضح قدم نہیں اٹھاتی اور اسی طرح عابد سے بھی دور بھاگتی ہے۔ صرف افگار ہی نہیں بلکہ معاشرے میں پائے جانے والی وہ تمام لڑکیاں جو افگار جیسے حالات میں پلتی ہیں یا پھر اس جیسی سوچ کی مالک ہوتی ہیں وہ بہت جذباتی ہونے کے ساتھ ساتھ ہر نئے دن ایک الگ طرز عمل کا اظہار کرتی ہیں اور بالآخر تنہائی، مایوسی، فرار اور نااُمیدی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔

یہ کہنے میں عار نہیں کہ اس قسم کی لڑکیاں ظاہری رکھ رکھاؤ، مصلحت سے پُر باتوں اور صلے کے لیے بناوٹی جوش کو قبول نہیں کرتیں بلکہ وہ ایک طرف ہوش اور دوسری طرف جوش سے جڑے اسباق پر یقین رکھتی ہیں۔ بے شک کہ اس ناول میں افگار کسی عجوبہ سے کم نہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے اردگرد اورآس پڑوس میں ایسے افراد ضرور آباد ہیں جو افگار کی طرح خود پرست طبیعت کے مالک ہیں۔ افگار چوں کہ ناول کی ابتدا ہی سے مایوس اور نااُمید ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی حساس طبیعت کے پیش نظر کبھی بھی شکست وپسپائی کو نہ تو برداشت کرتی ہے اور نہ ہی قبول کرتی ہے۔

مصنفہ نے اس کردار کو جس انداز میں بیان کیا ہے اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ بیمار اور موت کے خیال سے وابستہ ہے۔ افگار کہیں نہ کہیں منصور سے دلی طور پر وابستہ دکھائی دیتی ہے اور اس ضمن میں وہ نت نئے افکار وخیالات سے روشناس ہوتی ہے اور اپنے اندر تازگی اور جدت کو محسوس کرتے ہوئے خیالوں کی دنیا میں بہت آگے تک کا سفر کرتی ہے۔ اس حوالے سے ناول "نگری نگری پھرا مسافر" کا یہ حصہ دیکھیے:

> "اس وقت اسے یہ حیرت ہو رہی تھی کہ اسی آسمان کے نیچے وہ ہے اور یہی آسمان ذرا دور جا کر لاہور پر بھی پھیلا ہو گا۔ یہ موہوم سی قربت جو ایک آسمان کی نیچے بسنے سے اسے منصور کے ساتھ حاصل ہو رہی تھی۔ اس وقت ایک بڑی اہم بڑی ناقابل یقین حقیقت نظر آنے لگی۔ نیلا نیلا آسمان ان کے گھر دریا اور درختوں کے جھنڈ پر سے گزرتا ہوا ایک وسیع ملاپ کی طرح منصور کے کالج تک پہنچ گیا تھا وہ اس استعجاب کے لطف میں کھو گئی۔"(3)

اگر ہم اپنے معاشرے پر ایک نظر ڈالیں تو یہاں اب بھی بہت گھرانے اورافراد ایسے ہیں جو اپنے آباؤاجداد سے چلے آنے والے رسوم ورواج اورروایات کی مکمل پاسداری کرتے ہیں اوران سے انحراف کو معاشرے کے بگاڑ کا سبب مانتے ہیں لیکن اگر تصویر کا دوسرا رخ دیکھا جائے تو معاشرے میں ایسے افراد کی بھی کمی نہیں جو صدیوں سے قائم ان روایات کو ایک تازیانہ سمجھتے ہوئے روایات پسندی کے بُت کو ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے ہر قسم کے اظہارات کو تمام حدود و قیود سے آزادی دلوا کر خود کو معاشرے کا ایک اہم عنصر مانتے ہیں۔

ناول میں افگار کا کردار معاشرے میں پائے جانے والے ایسے لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے جو نہ تو پرانی قدروں پر یقین رکھتے ہیں اور نہ ہی مصلحت و مفاہمت کو اپنے لیے بہتر سمجھتے ہیں۔ناول میں محبت کو پوجا کے معنوں میں لیا گیا ہے۔ اس حوالے سے افگار اور منصور کے تعلق پر نظر ڈالی جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ پڑھنے والا کسی گورکھ دھندے میں پھنس گیا ہو کہ جس کا جو سرا پکڑا جائے وہ ہی ایک نیا جال دکھتا ہے۔ یہ تحریک انسان وانسانیت کے مابین جڑے ہوئے نصب العین،نظام فکر اور مقصود و مطلوب میں تغیر کا دوسرا نام ہے۔ اگر افگار کی محبت کا مشاہدہ کیا جائے تو اس میں ایک طرح سے عقیدت کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ اسے منصور سے قربت کی خواہش نہیں بلکہ سارا وقت وہ منصور کی شخصیت کو سمجھنے کی کشمکش میں گزار دیتی ہے۔ پاگل پن، جنونیت، جذبات کی شدت اور خیالات کی بہتات بہت بڑے معاشرتی مسائل کو جنم دیتے ہیں۔

اس ناول میں منصور ایک ایسے ہی کردار کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے جو اپنے جذباتی پن کے تابع ہو کر جُداگانہ منزلوں کا مسافر ہے۔ وہ خود کو ہر ایک سے چھپا کر رکھتا ہے لیکن کہیں کہیں اس کی چھپی ہوئی ذات خوب ظاہر بھی ہوتی ہے الغرض یہ کہ وہ ایک مخصوص معیار رکھتا ہے۔ جس طرح کسی بھی قوم یا گھرانے کے کچھ خاص اصول و آداب ہوتے ہیں جن پر انحصار کرتے ہوئے منازل کو پانے کی جستجو کی جاتی ہے بالکل اسی طرح اس ناول میں منصور بھی مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔اس کردار کو پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ منصور کبھی تو معاشرے کا ایک خاموش رُکن ہے تو کبھی وہ ایک بڑا عالم وفاضل بن کر سامنے آتا ہے اور کبھی ایک عاشق کا روپ دھار لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں خاندان میں پھیلنا شروع ہو جاتی ہیں۔اس ضمن میں ناول ''نگری نگری پھرا مسافر'' سے لیا گیا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "آج منصور نے اپنا نیا اوور کوٹ ایک راہ چلتے غریب مسافر کو دے دیا۔ ناچار دوسرا کوٹ بنوا کر اسے بھیجنا پڑا۔ آج منصور نے کرایے کے روپے کسی فقیر کو دے دیئے اور خود چالیس میل پیدل چل کر آیا ہے۔ماں روتے روتے اس کے پاؤں کے چھالوں پر پٹیاں باندھتی۔۔۔ بیٹا کب تمہیں ہوش آئے گا۔ کب تمہیں اپنی ماں کا خیال آئے گا، آج منصور نے تانگے والے کو پیسے دے کر خالی ہاتھ بھیج دیا اوراس پر بیٹھا نہیں کہ یہ بے زبان جانور پر ظلم ہے۔ سب اس پاگل پن پر کف افسوس ملتے سارے خاندان میں یہ بات پھیل گئی تھی کہ احمد خان کا لڑکا دیوانہ ہے۔۔۔ اورماں بہنیں ایسی باتیں سُن سُن کر روتی رہتی تھیں۔

> صرف افگار ہی ایسی تھی جس کا دل منصور کی باتیں سن کر خوشی اور تقدس کے جذبات سے معمور ہو جاتا ہے اور دل ہی دل میں کہتی۔۔۔ جنم جنم تو ان تقدس راہوں پر چلتا رہے۔ جنم جنم یہ مایا پرست لوگ تجھے تیری راہ سے نہ ہٹا سکیں۔"(4)

اس ناول میں افگار اور منصور کے حوالے سے جتنے بھی مختلف افکار و خیالات بیان کیے گئے ہیں وہ سب کے سب نوعیت کے اعتبار سے قطعی جداگانہ صورتوں میں ہیں۔ یہاں تک کے ان دونوں کے حوالے سے ان کے مابین جو نزدیکی یا دوری اور ذہنی و قلبی واردات ہیں وہ بھی یک طرفہ تماشہ ہی ہیں۔ ان دونوں کا جو بھی آپسی تعلق ہے وہ ایک قفل کی مانند ہے جو نہ تو کھلتا ہے اور نہ ہی صاف دکھتا ہے۔ افگار کا بچپن ایک گھر سے دوسرے گھر بھٹکتے گزرا جس کی وجہ سے وہ نہ صرف خود کو غیر محفوظ سمجھتی ہے بلکہ منصور پر بھی کُھل کر یقین نہیں رکھتی۔

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرے میں افگار کی مثل جن لڑکیوں کو صرف دھتکارا اور ٹھکرایا جانا نصیب ہوتا ہے ان میں ایسی عادات پرورش پا جاتی ہیں جو انھیں معاشرے سے منہ موڑ کر اکیلے رہنے جیسے کمزور فعل کے تابع کر دیتی ہیں۔ ہمارے چار سو بسنے والے لوگ اچھے ہوں یا برے مثبت سوچ کے مالک ہوں یا منفی سچ تو یہ ہے کہ زندہ رہنے اور معاشرے میں خود کی بقا کے لیے ہر کوئی ایک دوسرے سے کسی نہ کسی طور منسلک رہتا ہے۔

مانا کہ اکیلا رہنا کوئی بُری بات نہیں لیکن کوئی بھی انسان تنہا زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ زندہ رہنے اور زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے سماجی تعلقات از حد ضروری ہیں لیکن ایسے افراد جو افگار کے جیسے ہوتے ہیں وہ کبھی بھی کسی کے بنائے ہوئے قواعد و ضوابط پر انحصار نہیں کرتے بلکہ انھیں معیوب سمجھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جب منصور، افگار کے ساتھ گھر بسانے کی بات کرتا ہے تو وہ اُسے کمتر اور خود کو برتر جان کر اس کے ارادے سے باز رہنے کا کہہ دیتی ہے۔

معاشرے میں یا ایک ہی خاندان کے تمام افراد مختلف طور و اطوار کے حامل ہوتے ہیں اور مختلف نظریات کی حامل سوچ سے وابستہ ہوتے ہیں لیکن اگر وہ یہ سمجھ لیں کہ دوسروں کو کمتر یا حقیر جان کر وہ ہمیشہ آسودہ اور خوشحال رہیں گے ایسا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔ ناول نگار نے اپنے اس پہلے ناول میں اُمید، خواہشات، سمجھداری، سچائی، مسرتوں اور اعلیٰ و تعمیری عناصر کی شناخت کے لیے علامات و اشارات کا استعمال بھی بخوبی کیا ہے اور اس مقصد کے لیے مصنفہ نے مختلف کرداروں کے ذریعے اس کائنات، اس میں رہنے والے افراد اور عمر کے ساتھ ساتھ ماحول کے لحاظ سے بھی تمناؤں اور آرزوؤں کی ایک الگ بساط بچھائی ہے۔ زندگی سے مربوط جو بھی صورتیں ہیں افگار ان پر یقین رکھنے کے لیے کسی طرح تیار نہیں ہوتی جس کی وجہ سے وہ ایک انجانے خیال اور موہوم حاصل کے گرداب میں قید نظر آتی ہے۔ اس کی مثال افگار اور اجیارا کے درمیان سینی ٹوریم میں ہونے والی وہ گفتگو ہے کہ جس کے تحت امید و حقیقت کا ایک نیا روپ سامنے آتا ہے۔

مصفنہ نے فنی مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے ایک ایسی علامت پیش کی ہے کہ جس سے قارئین یہ سبق حاصل کرتے ہیں کہ زندگی میں چاہے جیسے بھی حالات پیش آئیں لیکن انسان کو کسی بھی مرحلے پر اُمید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ناول ''نگری نگری پھرا مسافر''میں اس حوالے سے دونوں کے مابین ہونے والی گفتگو ملاحظہ کیجیے:

> "تم یقین نہ کرو۔کرو گی بھی کیسے ؟لیکن یہ ایک حقیقت ہے امید میری نظروں سے اوجھل ہوگئ ہے۔ اجیار انے ایک ہی جملے میں ان مکڑی کے جالوں کو اپنی دانست میں سمیٹ پھینکا ابھی باہر چلو۔دیکھو ستارے ہیں کہ نہیں؟کھڑکی میں سے اس لیے نظر نہیں آتے کہ ان پر جالی لگی ہوئی ہے۔اورافگار کو اچانک خیال آیا کہ اس سادہ سی لڑکی نے انجانے میں زندگی کی اتنی بڑی حقیقت میرے سامنے بے نقاب کر دی ہے۔امید امٹ ہے اورابدی ہے۔خدا کی طرح،جس دن اُمید ختم ہو جائے گی اس دن کائنات بھی ختم ہو جائے گی۔وہ نظروں سے اوجھل ہو سکتی ہے۔غیر اہم،باریک جالیوں کی وجہ سے،فنا نہیں ہو سکتی۔"(5)

اس ناول میں مصنفہ نے یہ بتانے کی کوشش بھی کی ہے کہ افگار جیسے لوگ زمانہ قدیم کے نظم و انتظام،اصول وضوابط،عقائد و نظریات وغیرہ کو مکمل طور پر یا حتی الامکان تسلیم نہیں کرتے بلکہ ان میں سے انہی باتوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ جن کی وجہ سے انسان دوستی پروان چڑھے یا پھلے پھولے۔اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان جو کچھ دیکھ رہا ہوتا ہے وہ سچ نہیں بلکہ آنکھوں کا دھوکہ ہوتا ہے اس کے برعکس حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔

ہمارے معاشرے میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو ہر چیز کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے ان سے فاصلہ رکھتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ انھیں بے فائدہ قرار دے دیتے ہیں۔اس طرح کارویہ روارکھنے والے افراد محض دوریاں بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں جیسا کہ ناول میں افگار کے رویہ میں بھی ہمیں ایسی ہی بے چینی و دوری نظر آتی ہے۔وہ بہت سی چیزوں سے آشنا ہونے کے باوجود ان سے ہم آہنگی اختیار نہیں کرتی اور نتیجتاً اُس میں دور تک مایوسی اپنے پنجے گاڑھ لیتی ہے۔یہی وجہ ہے کے بے شمار اچھے اور محبت کرنے والے مرد اس کی طرف بڑھتے ہیں لیکن وہ اپنی اسی افتادِ طبیعت کے باعث کسی پر توجہ نہیں دیتی اور تنہائی کا عذاب جھیلتی ہے۔وہ اس درجہ جذباتی ہے کہ صرف اپنی ذات پر ہی کامل اعتماد رکھتی ہے۔تپ دق کی بیماری کی وجہ سے وہ سینی ٹوریم داخل ہوتی ہے اور مختلف مریضوں اورڈاکٹروں سے گفتگو کرتے ہوئے ظاہری چیزوں پر ہی توجہ دیتی ہے۔اس کا جذباتی پن اسے باطنی چیزوں اور گہرائیوں پر غور کرنے ہی نہیں دیتا۔

ہمارے ہاں یہ ایک بڑا معاشرتی مسئلہ ہے کہ صرف خود کو اوراپنی باتوں کو ہی درست ماننا باقی کوئی کچھ بھی کہتا رہے اسے درخوانتناہی نہ جاننا۔ناول میں ایسے رویے کی عکاسی مصنفہ نے افگار کے ذریعے کروائی ہے جب ایک مریضہ موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہوئی ہے اورڈاکٹر اسے بچانے کی سر توڑ کوشش میں ہوتے ہیں لیکن افگار یہ سمجھتی ہے کہ ڈاکٹر مریضہ کا ٹھیک علاج نہیں

کر رہے جس پر وہ چیختی چلاتی ہے اور ڈاکٹروں کو بے حس اور غیر ذمہ دار کہتی ہے لیکن ڈاکٹر کے سچائی بتانے پر وہ کسی حد تک یقین کر کے مطمئن بھی ہو جاتی ہے۔ اس حوالے سے ناول "نگری نگری پھرا مسافر" کا یہ حصّہ دیکھیے:

> "انہی دنوں نرس نے اسے بتایا کہ جنرل وارڈ میں ایک مریضہ قریب الموت ہے ڈاکٹروں نے اسے لاعلاج قرار دے دیا ہے اور اس کے مرنے کا انتظار سارے وارڈ پر طاری ہے۔ افگار دنگ رہ گئی۔۔۔ اسے یہ سنگدلی کی انتہا نظر آئی کہ ڈاکٹر یوں ایک مریض کو رضامندی سے مرنے کے لیے چھوڑ دیں وہ کچھ کرتے کیوں نہیں ؟ اسی شام اس نے ڈاکٹر زبیری سے پوچھا سچ ڈاکٹر۔ زرینہ ختم ہے ؟۔۔۔ ڈاکٹر زبیری نے اپنے مخصوص انداز میں شانے جھٹکے اور بڑے خوشگوار لہجے میں انگلیاں چٹخاتے ہوئے کہا بالکل ختم! اس کے پھیپھڑے چھلنی ہو گئے ہیں زیادہ سے زیادہ دس دن اور۔۔۔" افگار کو غصہ آ گیا اب وہ کسی حد تک ڈاکٹر سے کھل کر باتیں کر لیتی تھی۔ اس نے آنکھیں پھیلا کر کہا" تو گویا یہ بہت خوشی کی بات ہے" بے اختیار ہو کر ڈاکٹر زبیری ہنس پڑا۔۔۔ "اوہ یہ جذباتی لڑکیاں"! اس نے ہاتھ میں پکڑا ہو ہیٹ سر پر رکھ کر پھر اتارا اور انگریزوں کی نقل کرتے ہوئے تعظیماً جھکا" مس مراد! یہ زندگی اور موت کا کھیل ہے۔۔۔ اسے دیکھ کر ہمارے جذبات مردہ ہو چکے ہیں اور ہمارے دل سخت۔ وہ ہماری کوششوں کی حد سے باہر ہے۔"(6)

ناول نگری نگری پھرا مسافر کے حوالے سے اگر ہم محبت کے جذبے کی بات کریں تو میری ناقص رائے کے مطابق یہ بھی ایک بڑا معاشرتی مسئلہ ہے کیوں کہ آجکل کی محبت یکسانیت ، مادیت اور سطحیت کے جذبوں کے مرہون منت ہے جو ہر طرح کی آزادی کی قائل ہے۔ افراد معاشرہ چاہے وہ خواتین ہوں یا مرد حضرات وہ صرف حسن پرستی اور جذبات کی فراوانی کو ہی محبت سمجھتے ہیں۔

اس ناول میں مصنفہ نے اکثر مقامات پر یادوں میں کھو جانے والی کیفیات کو بھی بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر جیسے افگار بیٹھے بیٹھے اکثر ماضی کے دھندلکوں میں کھو جاتی ہے اور کبھی آنے والے وقتوں کے سفر پر نکل جاتی ہے۔ گو کہ ایسے راستوں پر چلنے والوں کو مکمل طور پر کامیابی حاصل نہیں ہوتی کیوں کہ یہ بھی سچ ہے کہ ہر ہاتھ ملانے والا دوست نہیں ہوتا اور نہ ہی انسان کو وہاں سے کبھی ہیرے موتی ملے ہیں جس سے انسان کی اکتسابی یا معاشرتی زندگی مکمل طور پر روشنی سے ہمکنار ہو البتہ انسانی سوچ کو ایسی چھوٹی چھوٹی چیزیں ضرور مل جاتی ہیں جن سے اس کے افکار کو خوشی اور طمانیت محسوس ہو۔

یہی وجہ ہے کہ افگار بھی خود کو مطمئن کرنے اور خوشیاں حاصل کرنے کے لیے نت نئے ہنگامے کرتی رہتی ہے اور اس کے لیے وہ تصورات کی دنیا میں کھو کر اپنے رشتہ داروں اور دوست احباب کو یاد کرتی ہے اور جب اسے حسب منشا آزادی و سکون نہیں ملتا تو وہ خود کو پیچ راہوں میں گم پاتے ہوئے منزل کی تلاش میں بے بس محسوس کرتی ہے۔ افگار اپنے خیالوں اور یادوں کے سلسلے کو

بھیانک خوابوں کا نام دیتے ہوئے خود کو راہ راست سے بہت دور تصور کرتی ہے۔ اسے تو یہ تک بھی معلوم نہیں کہ پرانی یادیں اس کے اندر کتنا زہر گھولیں گی۔ افگار نے بخوشی اپنے آپ کو ان خوفناک خوابوں کے ریلے میں بہنے دیا اور یوں وہ دو جداجدا دائروں میں زندگی بسر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

ایک دائرے میں سینی ٹوریم میں رہنے والے لوگ اور اس کے علاوہ اس کے چچا، چچی اور نوین و دیگر رشتہ دار قبضہ جمائے ہوئے تھے جب کہ دوسرے دائرے میں افگار کی انتہا پسندی اور بے سمتی پائی جاتی ہے۔ زمانہ قدیم میں مختلف لوگوں اور معاشرے کے دانشوروں کا خیال یہ تھا کہ اس کائنات کا وجود حرکت سے خالی ہے اور دنیا جامد و ساکن ہے لیکن پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا اور دنیا ترقی کرتی گئی تو وقت نے اس بات کو ثابت کیا کہ ہمارا گردوپیش نہ صرف رواں دواں ہے بلکہ مسلسل بڑھنے کے حق میں بھی ہے۔ تغیر و تبدل کے اس رجحان نے معاشروں کو فرسودہ خیالات و روایات کو چھوڑنے اور وقت کے تقاضے کو سامنے رکھتے ہوئے نئی نئی چیزوں کی ایجادات کرنے پر مجبور کر دیا کیوں کہ وقت کے ساتھ چلنا ہی ترقی کا ضامن ٹھہرا۔ اس نئے ترقی یافتہ معاشرے میں محبت و عشق کو بھی جدید معانی پہنائے گئے اور ثابت کیا گیا کہ ان کے بغیر زندگی کا بسر ہونا اور سانسوں کا چلنا محال ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔

محبت کے بارے میں مصنفہ نے افگار کے عجیب و غریب جذبات کو بیان کیا ہے۔ ناول میں وہ کسی بھی مرد کے لیے دلی طور پر محبت کے جذبات محسوس نہیں کرتی۔ یہاں تک کہ منصور کے لیے بھی اس زمرے میں اس کے احساسات اُلٹ پلٹ ہی ہیں۔ اس کے رویے سے یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ محبت کو خود کے لیے ایک قید سمجھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی بھی فرد کے لیے سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کرتی بلکہ ہر جگہ اس کے افکار مختلف ہی دکھائی دیتے ہیں۔

اگر ہم نثار عزیز بٹ کے افگار کی محبت کے سلسلے میں بیان کیے گئے خیالات کو ایک لڑی میں پیرونے کے بعد کسی نتیجے تک پہنچنے کی سعی کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ افگار بے شک پرانی روایات و اقدار میں تبدیلی کی خواہش رکھتی ہے لیکن اس کے باوجود ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ جس میں اسے محبت کی طلب محسوس ہوتی ہے اور اس تڑپ و طلب کا احساس اسے تب ہوتا ہے جب وہ اپنوں سے دور سینی ٹوریم میں وقت گزارتی ہے۔ اس ضمن میں ناول ''نگری نگری پھرا مسافر'' کا یہ حصہ پڑھیے:

> "وہ خاموش ہوگئی پھر جیسے سب کچھ کہہ ڈالنے کے ارادے سے اس نے کہا" بیماری نے یہ ساری خواہشیں دھندلی کر دی ہیں۔ اب مجھے محبت چاہیے صرف محبت۔" اس کے چہرے پر ایک شرمندہ سے مسکراہٹ چھاگئی۔ میں چاہتی ہوں کوئی مجھ سے محبت کرے۔ ان مٹ اتھاہ محبت! جس سے میری جنم جنم کی بھوک مٹ جائے۔"(7)

اس ناول میں نازک دھان پان سی افگار کے روپ میں ہمارے معاشرے کی عورت کو ایک ہی وقت میں دو دنیاؤں کا سفر طے کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ایک دنیا اس کے اندر کے فن کو باہر لاتی ہے جس میں ٹیگور، کیٹس اور براؤننگ وغیرہ جیسے شعرا کو اس کے فنی عروج کی بڑھوتری میں مدو معاون دکھایا گیا ہے۔

اسی دنیا میں اس کے ماضی کی یادوں، جذبات اور نفسیاتی الجھنوں کی کشمکش کی عکاسی بھی ہوتی ہے جب کہ دوسری دنیا تپ دق کی بیماری کے دوران سینی ٹوریم میں قیام ہے جس میں وہ خود، ڈاکٹر، نرسیں اور افگاری کی نئی بننے والی سہیلیاں ہیں جو ایک دوسرے کی راز دار اور دکھ درد میں شریک ہیں۔ سینی ٹوریم کی مضطرب دنیا اس کی ذہنی پریشانی و بے چینی میں شدید اضافہ کرتی ہے۔ لوگوں کی اُمید و نااُمیدی، آنکھوں میں زندگی جینے کی اُمنگ اور کملاتے چہرے اس کے جذبات کو مجروح کرنے اور ان میں ہلچل مچانے کے لیے بہت کافی ہیں۔

یہ ناول اس بات کو عیاں کرتا ہے کہ معاشرے میں مختلف خاندانوں اور ماحول میں پروان چڑھنے والی عورتیں یا لڑکیاں ذہنی تجربات کی کئی دنیاؤں سے گزرتے ہوئے خود کو لہولوہان کرتی ہیں اور سفر کی یہ تھکان ان کی رگ رگ میں سرایت کر جاتی ہے۔

افگار جیسی لڑکی کے روپ میں مصنفہ نے یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ ہمارے معاشرے کی خواتین بے شک جسمانی طور پر بیمار ہوں لیکن وہ ذہنی طور پر جذباتی بھی ہیں جو کیسے بھی حالات سے گزریں لیکن خود میں اچھائیاں پیدا کرنے کی کوشش تادم مرگ کرتی رہتی ہیں اور اپنی قوت ارادی کو کمزور نہیں پڑنے دیتیں:

> "بچپن میں پیار اور لاڈ کی کمی اور اس کے اپنے سراپا میں کسی نمایاں کر دینے والی خصوصیت کے فقدان نے اس کی فطرت سے خود اعتمادی کی جڑیں اکھیڑ دی تھیں اسی لیے وہ اپنے آپ میں زیادہ سے زیادہ اوصاف پیدا کرنے کی متمنی تھی۔ اپنی ذات میں اوصاف پیدا کرنے کے لیے افگار کو قوت ارادی کا مسلسل استعمال کرنا پڑتا تھا اور اسی لیے اس کی یہ قوت بڑھتی گئی۔ گھنٹہ دو گھنٹے گرمیوں میں بڑی خالہ کو پنکھا جھلتے رہنا کہ جاگ کر وہ کہہ دے۔ "افگار بڑی اچھی بچی ہے۔" جب کہ اس کا دل سارا وقت صحن میں نیلے، انگوری اور سرخ کانچ کے بلوروں سے کھیلتے ہوئے بچوں کے ساتھ ہو۔ اپنی خواہشوں پر قابو پائے بنا کیسے ہو سکتا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ خواہش دبا لینے کا نتیجہ ہمیشہ خوشگوار ہوتا ہے تو تیاگ کو اس نے زندگی کا ایک اہم جزو بنالیا۔ ہوتے ہوتے اپنی ہر چھوٹی خواہش کا گلہ گھونٹ دینے سے اسے ایک وحشیانہ خوشی ہونے لگی۔"(8)

ہمارے معاشرے میں بہت سے افراد ایسے ہیں جن کی زندگیاں مصائب والم کا نمونہ یا مثال بن جاتی ہیں۔ یہ لوگ اپنے غموں کو برداشت کرتے کرتے خالق حقیقی سے جاملتے ہیں لیکن اپنے غموں کا سودا نہیں کرتے۔ مصنفہ کے اس ناول میں بھی ایسے کردار جابجا نظر آتے ہیں جن کو مسلسل کربناک حالات میں زندہ رہنا پڑتا ہے۔ ان کرداروں کا بڑا المیہ یہ ہوتا ہے وہ اپنے اوپر آئی

مصیبوں اور مشکلات کو اپنا نصیب سمجھ کر قبول و برداشت کرتے ہیں اور انھیں ختم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرتے۔ اس ناول میں معاشرے کے ایسے کرداروں یا افراد کی نشاندہی وحید اور سعیدہ کے ذریعے کروائی گئی ہے۔

وحید جب اداس و ملول ہوتا ہے اور مایوسیوں کے گھپ اندھیروں میں ڈوب رہا ہوتا ہے تو افگار اس کو دنیا کی خوشیوں اور رونقوں کی طرف متوجہ کرنے کی سر توڑ کوشش کرتی ہے لیکن اس کے باوجود وحید مایوسی کی کیفیت میں ہی رہتا ہے اور وہ اچھائیوں اور رنگینوں کے بارے میں سوچتا ہی نہیں اور سارا وقت قنوطیت کا شکار رہ کر گزارتا ہے۔ یہ ایک سنجیدہ معاشرتی مسئلہ ہے کہ جب افراد معاشرہ یا معاشرے کے اکثر و بیشتر افراد کسی بیماری کا شکار ہو جائیں تو وہ بجائے مثبت سوچنے کے اپنے ذہنوں کو منفی سوچوں سے پراگندہ کر دیتے ہیں اور خود اپنی جان کے دشمن بن جاتے ہیں۔ بیشتر مریض صرف اس لیے اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں کیوں کہ وہ خود اپنے اندر سے قوت مدافعت ختم کر دینے کی بڑی وجہ بنتے ہیں۔

یاد رہے کہ جب تک ہم خود اپنے اندر کسی بھی بیماری، غم یا پریشانی سے لڑنے کا حوصلہ اور طاقت پیدا نہ کریں گے تب تک نہ تو کوئی دوا کام آئے گی اور نہ ہی کوئی دعا۔ ہمارے رب نے بھی مایوسی کو کفر کہا ہے تو پھر ہم اپنے رب کے خلاف کیسے جا سکتے ہیں۔ افراد معاشرہ اس بات پر پورا اختیار رکھتے ہیں کہ وہ اپنی زندگیوں کو جہنم یا جنت بنا سکیں۔ ویسے بھی زندگی مرنے والوں کے ساتھ مر جانے کا نام نہیں بلکہ ان کی یادوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے آگے بڑھ جانے کا نام ہے ورنہ ایک جگہ پر ٹھہر جانے سے تو پانی بھی گندا ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں ناول "نگری نگری پھرا مسافر" میں افگار اور وحید کے درمیان ہونے والی گفتگو ملاحظہ کیجیے:

> "لیکن وحید بھائی روشن پہلو پر نظر رکھنے کو بالکل تیار نہ تھے۔ کہنے لگے:" جیسے ہی ڈالیاں شگوفوں کے بار سے جھکنے لگیں گی نیلے آسمان سے بجلی گر کر اسے راکھ کر جائے گی۔" ہائے اللہ!" افگار نے کنکھیوں سے سعیدہ کو دیکھا کہ کہیں وہ وحید بھائی کی قنوطیت کو ذاتی رنگ میں تو نہیں لے رہی۔ ایسا نہ کہیے وحید بھائی۔۔۔ ہم خود اپنی زندگی کو بے معنی بنا دیتے ہیں اور خود ہی چاہیں تو اسے بامعنی بنا سکتے ہیں۔ آپ جتنی قوت قنوطیت میں ضائع کرتے رہے ہیں اسے صحیح راستے پر لگا کر اس سے مستفید بھی ہو سکتے ہیں۔ اسے خیال آیا کہ اوروں کو نصیحت خود میاں فضیحت۔۔۔"(9)

نگری نگری پھرا مسافر میں مصنفہ نے گردوپیش کے ماحول کی بھی بڑی کامیاب عکاسی کی ہے۔ انھوں نے ناول کے کسی حصہ میں بھی ایسے مجسمے تخلیق نہیں کیے جن میں روح موجود نہ ہو بلکہ انھوں نے زندہ اور متحرک کرداروں کو پیش کیا۔ اس کے علاوہ مصنفہ نے اداس و غمناک ماحول کو بیان کرنے میں بھی کافی چابکدستی کا ثبوت دیا۔ اس ناول میں مذہب، اخلاق حتیٰ کے مابعد الطبیعیات مسائل پر بھی بحث و مباحثے موجود ہیں۔

ناول کا سب سے متحرک کردار افگار جب ہر سو سے خود ساختہ اداسی کا شکار ہو جاتی ہے تو پھر اسے خدا بھی یاد آتا ہے اور وہ خدا کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ ویسے یہ بھی سچ ہی ہے کہ جب انسان کو چاروں طرف سے اندھیرے ہی ملتے ہیں تو اسے خدا ضرور

یاد آتا ہے اور پھر وہ دنیاوی سہاروں کو چھوڑ کر صرف اللہ سے پناہ مانگتا ہے اور اسی کی پناہ میں آنے کی کوشش بھی کرتا ہے بالکل افگار کی طرح کیوں کہ افگار بھی جب مسلسل ناامیدی، شکست، ناکامی، بے مرادی اور بے یقینی جیسے عذاب میں ڈوب جاتی ہے تو اس وقت خدا کی جانب متوجہ ہوتی ہے۔

اس ناول میں بہت سی جگہوں میں وہ خدا کی محبت اور اس ذات باری تعالیٰ پر یقین کرتی نظر آتی ہے بالخصوص رات کے اوقات میں جب مایوسی اس پر غلبہ پاتی ہے تو وہ خدا سے دعائیں مانگتی نظر آتی ہے۔ اس ناول میں معاشرے کے ایسے کرداروں پر سے بھی پردہ اٹھایا گیا ہے جن پر نت نئے خیالات آشکارہ ہوتے ہیں اور وہ دنیا کے ساتھ چلتے ہوئے اسی کے رنگ میں خود کو رنگتے چلے جاتے ہیں۔ ایسے لوگ قدیم مشغلوں اور محفلوں کو چھوڑ کر جدید یت کو اپنانے سے گریز نہیں کرتے۔ آج کی دنیا اتنی ترقی یافتہ اور اس کی رفتار اس قدر تیز ہو چکی ہے کہ اب اس میں ٹھہراؤ کی جگہ حرکت نے لے لی ہے۔ بے معنی چیزوں اور بے کار باتوں کا زمانہ کب کا ختم ہو چکا اور تبدیلی کا سفر شروع ہو چکا ہے۔

ہمارے معاشرے میں بناوٹ اور تقلید کا بہت زیادہ رجحان پایا جاتا ہے۔ دوسروں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے افراد معاشرہ اصل و نقل کا فرق تک بھلا چکے ہیں۔ ہمارے معاشرتی مسائل میں ایک یہ بھی ہے کہ لوگ ہر وقت دوسروں کی غلطیوں اور منفی باتوں پر بڑی گہری نگاہ رکھتے ہیں جس کی وجہ سے معاشرے میں منفی رجحانات میں تیزی آئی ہے۔ اس ناول میں مصنفہ ہمارے معاشرے میں پھلتے پھولتے مسائل کے حوالے سے بڑے انوکھے سوالات کو اٹھاتی نظر آتی ہے۔ ان سوالات میں حق و باطل میں تمیز، نیکی کا حصول، خود غرضی، سچائی کا ناپید ہونا، جھوٹ کا بول بالا ہونا اور تحقیق سے منہ موڑنا شامل ہیں۔

مصنفہ اس بات پر زور دیتی نظر آتی ہیں کہ آخر افراد معاشرہ کب تک دوسروں کی تمناؤں پر سمجھوتا کرتے ہوئے اپنی خوشیوں کا گلا گھونٹے رہیں گے۔ بے شک کہ ایسا کرنا شاید وقت اور ماحول کی مناسبت سے درست ہو لیکن اب وہ دور آ گیا ہے کہ ہمیں خود اپنے ذہن سے سوچنا ہو گا اور سوچ کے زاویوں اور معنی و مفاہیم میں تبدیلی لازم ہے کیوں کہ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ ہم لغزشوں، گمراہوں اور حقیقتوں کے درمیان فرق نہ کرتے ہوئے بناوٹی لوگوں، حکمرانوں لیڈروں اور آقاؤں کے فیصلوں پر من و عن سر تسلیم خم کر دیں اور اپنی عقل پر ان لوگوں کو غالب آنے دیں۔ مصنفہ نے ان تمام باتوں کا اظہار ناول "نگری نگری پھرا مسافر" میں کچھ اس انداز میں کیا گیا ہے:

> "میں کہتا ہوں جب وقت کے تقاضے شدید ہو جائیں گے تو دنیا خود بخود تبدیل ہو جائے گی۔۔۔ اس وقت ہم بھی تبدیلی قبول کر لیں گے۔۔۔ افگار چڑھ جاتی ہے۔۔۔ تمہاری طرح ہر ایک ہی کہنے لگے تو دنیا اپنی جگہ ساکت ہو جائے ہم کیوں اندھا دھند دنیا کا پیچھا کریں۔ ہم خود کیوں نہ سچ کی تلاش کریں۔۔۔ کیا واقعی سچ کا کوئی علیحدہ خالص وجود دنیا میں ہے؟ کیا ہر نیکی آخری تشریح کی حد تک پہنچ کر زیادہ سے زیادہ

> لوگوں کو فائدہ پہنچانے کی سعی بن کر نمودار نہیں ہوتی؟۔۔۔چوری مت کرو کہ کسی کو تکلیف نہ ہو۔۔۔ جھوٹ مت بولو کہ دوسرے دھوکہ نہ کھائیں۔۔۔خود غرضی سے احتراز کرو کہ معاشرے میں انتشار نہ پیدا ہو۔۔۔ ہر نیکی معاشرے کو زیادہ پر امن زیادہ خوشحال بنانے کی سعی ہے۔۔۔اس لحاظ سے سچ کا بذات خود تو کوئی وجود نہ رہا جو جتنا اچھا شہری ہے۔۔۔اتنا ہی نیک اور سچا ہے چاہے وہ قدم قدم پر جھوٹ بولے۔"(10)

مصنفہ نے اس ناول میں زیادہ تر معاشرے کے پڑھے لکھے طبقے کی لڑکیوں کی سوچ، جذبات اور مسائل پر روشنی ڈالی ہے جو مغربی مفکرین سے اس درجہ متاثر ہیں کہ اُنہی کے انداز میں سوچ وبچار کے انداز کو اپنانے میں فخر محسوس کرتی ہیں۔ناول کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس میں ایک مخصوص طبقے کے معاشرتی ماحول کو بیان کیا گیا ہے۔

ناول میں بیان کردہ کرداروں کے بیانات ومباحث ذہانت سے پُر نظر آتے ہیں اوران کی گفتگو میں فلسفیانہ فکر جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔چوں کہ مصنفہ ٹالسٹائی اوراسپنیگلر وغیرہ سے متاثر ہیں جس کی وجہ سے ناول کی بہت سی تحریروں میں ان کے خیالات کا عکس پایا جاتا ہے جس کے ذریعے وہ یہ بتانے کی کوشش کرتی ہیں کہ تقدیر عقل کل پر غالب آتی ہے یہی وجہ ہے کہ انسان صرف واقعات کا حصّہ اور سیل زمانہ کے سامنے خس و خاشاک سے زیادہ کی اہمیت نہیں رکھتا۔ انسان کی مرضی، خواہشات اور تدابیر سب خالق حقیقی کی بنائی گئی تقدیر کے سامنے بے بس ہیں۔ ناول "نگری نگری پھرا مسافر" میں وہ ٹالسٹائی کے ناول وار اینڈ پیس کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک کردار کی زبانی کہتی ہے:

> "ویسے تو "وار اینڈ پیس" کا مرکزی خیال ایمان بالغیب نہیں تھا دراصل ٹالسٹائی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ مورخ جو جنگ اورانقلاب کا ذمہ دار کسی ایک کو جرنیل، ہیرو یا شہنشاہ کو ٹھہراتے ہیں یہ غلط ہے۔ ایک واقعہ اس لیے وقوع پذیر ہوتا ہے کہ وہ ناگزیر ہے اورایک خارجی ہستی، ایک خارجی طاقت کے زیر حکم ہے۔ جرنیل اور شہنشاہ تو خود واقعات کا جزو ہوتے ہیں اس لیے وہ واقعات کی وجہ اور جواز نہیں بن سکتے۔"(11)

مصنفہ نے اس ناول میں افگار کے کردار کو بڑی محنت سے تراشا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اسے اتنا بلند ہمت وباحوصلہ دکھایا ہے کہ اپنی زندگی کے تمام تر کٹھن اور نامساعد حالات کا مقابلہ وہ بڑی بہادری سے کرتی ہے۔ اگر افگار کے کردار کو مد نظر رکھ کر ہم اپنے گردوپیش پر نگاہ ڈالیں تو بلاشبہ ہمیں اپنے معاشرے میں بے شمار افگار جیسی خواتین ملیں گی جن کی زندگیاں باعث مثل اور بلند ہمتی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

مصنفہ نے اس کردار کو اجاگر کر کے اس کے گرداگرد اور بھی بہت سے کردار جمع کیے ہیں جن کی زندگیوں پر روشی افگار کے توسط ہی سے ڈالی گئی ہے۔ چوں کہ افگار ایک پڑھی لکھی اور باشعور لڑکی ہے یہی وجہ ہے کہ ناول پڑھتے ہوئے بحیثیت قاری اس کی فہم وفراست کا بار بار ادراک ہوتا ہے۔ ناول کے دیگر کردار جو ستاروں کی مانند ہیں وہ افگار سے روشنی حاصل کرتے ہوئے اس کی

چمک اور تابندگی میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ افکار معاشرے سے متعلق اس قدر فکری، فلسفیانہ اور تاریخی باتیں عیاں کرتی ہے جس کی وجہ سے قاری کو اس کے صلاحیتوں کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اس ضمن میں ناول "نگری نگری پھرا مسافر" سے لیا گیا یہ ٹکرا پیش نظر ہے:

> "معاشرہ ترقی اور تعمیر کی کسی منزل پر پہنچ کر رک بھی جائے گا۔ یہ تصور میں نہیں کر سکتی۔۔۔ لیکن انسان کی جدوجہد کا یہی عالم رہا تو کبھی نہ کبھی کمال کی منزل آہی جائے گی اور جدوجہد کی غیر موجودگی میں زندگی کا قیام مجھے تو ناممکن نظر آتا ہے۔۔۔ پھر شاید قیامت آجائے گی اور مکمل عدمیت۔ شاید کمال کی تلاش میں انسان خود اپنی نیست کا سامان کر رہا ہے۔"(12)

نثار عزیز بٹ نے اس ناول میں جدت اور روایت کی کشمکش کو بیان کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ تہذیب و تاریخ کو بھی نمایاں طور پر عیاں کرتی نظر آتی ہے۔ نگری نگری پھرا مسافر آج سے کافی عرصہ پہلے منظر عام پر آیا لیکن اس میں ایک لڑکی کے ذریعے بہت سے گھرانوں کی جو کہانیاں بیان کی گئیں ہیں وہ نہ صرف انسانی جبلت کے بڑے قریب ہیں بلکہ ہمارے معاشرے کی حقیقت پر مبنی تصویر کشی بھی کرتی ہیں۔

بلاشبہ ہمارے ہاں بھی مغرب کی طرح اصناف ادب پر مقبولیت اور عدم مقبولیت کے ادوار رونما ہوتے رہے لیکن ناول ایک ایسی صنف ادب ہے جو ہمارے ادب میں نسبتاً کم لکھے جانے کے باوجود ہر دور میں کسی نہ کسی حد تک ارتقا کا اگلا قدم اٹھاتی رہی ہے۔ اردو ناول نے نثار عزیز بٹ کے دور تک آتے آتے قریباً ایک صدی سے زیادہ کا سفر طے کر لیا ہے اور یہ عرصہ مغرب میں ناول کے ارتقائی سفر کے مقابلے میں اگرچہ زیادہ نہیں تاہم اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ مقبول روایتی ناولوں کی افراط میں متعدد ایسے ناول بھی لکھے گئے جن پر ہم فخر کر سکتے ہیں اور انہی ناولوں میں سے ایک ناول نگری نگری پھرا مسافر بھی ہے۔

مصنفہ کے اس ناول میں جذبات، قنوطیت، امید و یاس حکمت و فلسفہ الغرض کہ اس کے علاوہ بھی سب ہی کچھ پایا جاتا ہے کہ جس کے ذریعے معاشرتی زندگی اور اس سے منسلک مسائل و پریشانیاں ہمیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ ہم جس معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں وہاں ایک اکیلی عورت کو کوئی تحفظ حاصل نہیں ہے چاہے وہ کتنی ہی عقل مند، باشعور اور پڑھی لکھی ہو۔ اگر وہ اپنے والدین، بہن بھائیوں یا پھر اپنے خاوند کے ساتھ رہتے ہوئے کسی سے بھی کوئی تعلق واسطہ رکھے اس پر کوئی بھی انگلی نہیں اٹھا سکتا کیوں کہ اس کے پیچھے اس کا خاندان پشت پناہی کر رہا ہوتا ہے اور گلی، محلے یا آس پڑوس کے لوگ کوئی بھی بات کرنے سے پہلے سو دفعہ سوچتے ہیں۔

اس ناول میں قارئین پر یہ بات بھی عیاں ہوئی ہے کہ ایک لڑکی کو شادی جیسے پاکیزہ بندھن میں ضرور بندھنا چاہیے کیوں کہ چاہے کچھ بھی ہو مرد ہی ایک عورت کے لیے مضبوط سہارا ہوتا ہے۔ چاہے وہ بھائی کے روپ میں ہو یا پھر مجازی خدا کے روپ میں۔ اس حوالے سے ناول "نگری نگری پھرا مسافر" کا یہ حصہ زیر غور ہے:

> پہلی دفعہ عرفان اکیلا اس کے پاس آیا تو نوین وہیں تھا اور نسیم افگار کے پاس پڑھنے آئی ہوئی تھی۔۔۔اس لیے اسے کوفت نہیں ہوئی اور باتوں باتوں میں وقت اچھی طرح کٹ گیا۔ دوسرے دن عرفان آیا تو افگار اکیلی تھی۔۔۔اس کی سوشل سپر ایگو نے تیوری پر بل ڈالنے شروع کر دیئے۔ تیسرے دن عرفان آیا تو افگار پھر اکیلی تھی۔ مسلسل پانچ گھنٹے کی گفتگو کے بعد جب گہرے اندھیرے میں عرفان کے قدموں کی چاپ رات کی خاموشی میں تحلیل ہو گئی تو ذہنی اور جسمانی طور پر قطعی نڈھال ہو کر افگار اپنے بستر پر پڑی رہی اس نے سوچا یہ زیادہ دیر نہیں چل سکتا۔ کل بھی ممتاز کی آنکھوں میں استفسار تھا آج وہ شبے میں تبدیل ہو گیا ہو گا اور شیر گل کتنی دیر سے حیران تھا کہ کھانے کا وقت نکلا جاتا ہے اور مہمان لگاتار باتوں میں مصروف ہے۔ مسز ہارون کئی مرتبہ پچھلے بر آمدے کا چکر لگا گئی تھی۔۔۔یہ لوگ اب بیٹھے کھسر پھسر کر رہے ہوں گے۔۔۔جانے کون تھا؟ بڑی دیر سے بیٹھا ہوا تھا۔(13)

ناول میں جس طرح افگار انوکھے اور منفرد خیالات کی حامل ہے بالکل اسی طرح اس سے متعلق مصنفہ نے جو احساسات وخیالات لکھے ہیں ان کے نتائج تک پہنچنا بھی ایک قطعی مشکل کام ہے۔ بے شک کہ اس ناول میں کچھ باتیں ایسی تھیں جو شکوک وشبہات پیدا کرتی ہیں۔

اس ناول میں ہمارے معاشرے کا ایک بہت قابل فکر پہلو بھی بیان کیا گیا ہے اور وہ ہے خود غرضی جس کے بارے میں افگار یہ سوچتی ہے کہ یہ اچھی بات ہے لیکن اگر ہم اس کردار سے ہٹ کر سوچیں تو یہ ہمارے معاشرے کا ایک منفی اور سفاک مسئلہ ہے۔ ہمارے ارد گرد یہاں تک کہ ہمارے گھروں اور خاندانوں میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو صرف خود اپنی ذات کے لیے جیتے ہیں اور ہر اچھی چیز پر صرف اپنا حق سمجھ کر اسے چھین لینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ایسی صورتحال میں معاشرے کی خوشحالی اور امن وسکون کے لیے ایسے افراد کی تربیت اور علاج از حد ضروری ہے تاکہ کسی بھی قسم کے انتشار سے بچا جا سکے۔

مصنفہ افگار کے ذریعے ایسے حقائق سے پردہ اٹھانا چاہتی ہیں جو خود غرض لوگوں کی وجہ سے منظر عام پر نہیں لائے جاسکتے کیوں کہ مصنفہ کا مقصد ایسے دروازے کھولنا ہے جس کی وجہ سے لوگوں میں انسانیت جنم لے اور اپنی ذات کے ساتھ ساتھ دوسرے افراد بھی سب کے لیے اہمیت کے حامل ہوں۔

افگار بھی رسم ورواج اور ان دیکھے بندھنوں کی قید سے آزاد ہو کر کھلی فضا میں آزادی کے ساتھ جینا چاہتی ہے اور معاشرے کے کم حیثیت یا غریب لوگ جن میں مزدور، کسان اور پس ماندہ طبقے کے افراد شامل ہیں کے ساتھ گھلنا ملنا چاہتی ہے یا اس کی خواہش رکھتی تاکہ اپنے اندر کی گھٹن کو ختم کر سکے۔ اس حوالے سے جب ناول کے آخری صفحات میں سفر کے دوران کمال انور افگار سے پوچھتا ہے کہ وہ آخر کیا چاہتی ہے اور وطن میں ایسی کیا چیز تھی جو اسے زندہ رہنے اور آگے بڑھنے سے روکتی ہے تو افگار نے جو جواب دیا اسے ناول ''نگری نگری پھرا مسافر'' کا یہ حصہ دیکھ کر بخوبی اس کی سوچ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

> "اچانک افگار نے اپنے بھگوڑے پن کو برحق ثابت کرنے کی سخت ضرورت محسوس کی۔ اس شخص کی مکمل اجنبیت کو بالکل بھولتے ہوئے اس نے کہاوطن میں مدتوں کے رسم ورواج میرے پاؤں میں زنجیر بن کر پڑ گئے تھے۔ میں چاہتی تھی کہ کسانوں کے ساتھ کھیتوں میں کام کروں، مزدوروں کے ساتھ کانوں کی تہ میں اتروں، ایک شہر سے دوسرے شہر تک پیدل سفر کروں اور قدیم انسان کی طرح کھلی فضا میں کھیتوں میں سوؤں۔ ہمارے وطن میں عورت شدت سے مجبور ہے۔"(14)

اس ناول میں جہاں اور بہت سی باتیں جو افگار سے وابستہ ہیں انوکھی اور عام روایت سے ہٹ کر ہیں وہیں ناول کے اختتامیہ میں بھی مصنفہ نے افگار کے آخری الفاظ میں ایک منفرد نکتہ نظر بیان کیا ہے۔ اس ترقی یافتہ دور میں چاہے وہ افگار ہو یا کوئی اور جلد از جلد بہت کچھ پانے کی دوڑ میں شریک ہے اور ہر فرد یہ خواہش رکھتا ہے کہ فوراًاپنی منزل کو حاصل کر لے قطع نظر اس کے کہ یہ دنیا فانی ہے۔

جس طرح یہ دنیا ایک دن فنا ہو جائے گی بالکل اسی طرح انسان بھی یہاں سے رخصت ہو کر ہمیشہ کے لیے مٹی کے ساتھ مٹی بن جائے گا۔ انسان مادی خواہشات کے پیچھے بھاگتے بھاگتے یہ بھول چکا ہے کہ ایک دن وہ زوال پذیر ہو جائے گا اور موت کے ہاتھوں شکست بھی کھائے گا لیکن پھر بھی پتہ نہیں کب افراد معاشرہ منزل کو حاصل کرنے سے لے کر مطلوبہ مقاصد کو پانے تک کی فکر کو چھوڑتے ہوئے قرب خداوندی کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

مختصر یہ کہ اس ناول میں مصنفہ ہمارے معاشرے کی لڑکیوں کے بہت سے مسائل کی عکاسی کرنے میں کافی حد تک کامیابی سے ہمکنار ہوئی ہیں۔ نثار عزیز بٹ لڑکیوں سے متعلق ایسے احساسات، خیالات اور جذبات کو اس ناول کے ذریعے ضبط تحریر میں لائیں ہیں کہ جن پر کوئی بھی ناول نگار کم ہی قلم اٹھانے کا قصد کرتے ہیں۔ مصنفہ کی اس تخلیق کے عمیق مطالعے اور کرداروں کے وسیع مشاہدے کے ذریعے ان کے مقام اور مرتبے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

حوالہ جات

1. نثار عزیز بٹ، نگری نگری پھرا مسافر (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2009ء)، 9۔
2. نثار عزیز بٹ، نگری نگری پھرا مسافر، 11۔
3. ایضاً، 24۔
4. ایضاً، 41۔

5. ایضاً،63۔

6. ایضاً،65۔

7. ایضاً،77۔

8. ایضاً، 118۔119۔

9. ایضاً،131۔

10. ایضاً، 162۔163۔

11. ایضاً، 180۔

12. ایضاً،164۔

13. ایضاً،166۔

14. ایضاً،232۔

References in Roman Script

1. Nisar Aziz Butt, nagri nagri phira musafir (Lahore: Sang-e-meel Publications, 2009), 9.
2. Nisar Aziz Butt , Nagri Nagri phira Musafir, 11.
3. Ibid, 24.
4. Ibid, 41.
5. Ibid, 63.
6. Ibid, 65.
7. Ibid, 77.
8. Ibid, 118-119.
9. Ibid, 131.
10. Ibid, 163.
11. Ibid, 180.
12. Ibid, 164.
13. Ibid, 166.
14. Ibid, 232.